© rasailojaraid.com

استاذ کا مقام، سیکھنے سکھانے کے آداب

اور ہماری نصابی اساس

ڈاکٹر محمد عارف خان ساقی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ کراچی

خلق خدا کے اندر سے بے علمی و ناخواندگی، کم عقلی و نادانی اور کم علمی و جہالت کو دور کرنے اور فہم و شعور کے فروغ کے لیے پوری تندہی کے ساتھ اقدامات کرنے کو قرآن حکیم نے ''جہادِ کبیر'' کا نام دیا ہے۔ دنیا دار العمل ہے۔ مگر جزا فقط آخرت پر موقوف نہیں ہے۔ خود زندگی بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے۔ یہ دنیا ایک خارزار کی مانند ہے۔ ہر سو کانٹے بکھرے پڑے ہیں۔ کچھ انگلیوں سے چنے جاسکتے ہیں مگر کچھ ہیں جنہیں پلکوں سے چننا پڑتا ہے۔ ایسے ہی جیسے ہاتھوں کی لگائی ہوئی کچھ گرہیں دانتوں سے کھولنی پڑتی ہیں۔ ایسے میں ایک ہوش منداور بیدار مغز آدمی آنکھیں بند نہیں رکھ سکتا۔ کوئی بھی غیر محتاط اقدام تباہی و بربادی کے عمیق گڑھے میں گرا سکتا ہے۔ حساس، بیدار مغز اور غیور قومیں اپنے افراد پر کڑی نگاہ رکھا کرتی ہیں۔ ایسے ہی جیسے ایک ہی کشتی کے سوار نیلے پانیوں کے گہرے سمندر میں پہنچ کر اپنے کسی ساتھ کو یہ اجازت ہرگز نہیں دے سکتے کہ کشتی کے پیندے میں سوراخ کردے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی حرکت ہے کہ جس کا نقصان اجتماعی ہے۔ صرف پیندے میں سوراخ کرنے والا ہی نہیں کشتی ڈوبے گی تو سب مریں گے۔ کچھ بے اعتدالیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا نقصان پورے معاشرے کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً کسی قوم کے تعلیمی نظام کا ڈھانچہ اگر کمزور یا برباد ہو جائے تو قوم کو تباہی سے بچانا ممکن نہیں رہتا۔ ایسے ہی افتراق و انتشار کا معاملہ ہے۔ فرقہ واریت سے قوم تقسیم ہوتی ہے۔ توانائی بٹ جاتی ہے۔ بحیثیت ایک متحدہ قوم کے اقوام عالم میں جگہ نہ ملے تو ایسی قوم کو کوئی بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کا سب کہا سنا رائیگاں جاتا ہے۔ اس کی باتوں پر کوئی کان دھرنے کا روادار نہیں ہوتا۔ شعورِ اجتماعی کا فقدان قومی وقار کے لیے صدمے کا باعث ہوتا ہے۔ توانائی کے حصول کے ذرائع مسدود ہونے لگتے ہیں۔ فرقہ واریت ایک مسلسل خانہ جنگی کی شکل اختیار کرلے تو دشمن کو وار کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔ اپنے لوگ ہی اپنائیت کی آڑ لے کر دشمنوں کے مقاصد کی تکمیل کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ ایک طویل اور اعصاب شکن ماحول سے نکل کر امتِ مسلمہ ایک نئی زندگی کی آس لیے اپنے وجود کو سمیٹ رہی ہے۔ قوموں کی تعمیر کا عمل ہو یا تخریب کا اساتذہ برادری کا کردار ہمیشہ محوری اور مرکزی نوعیت کا ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک قوم کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حیات کے ضامن زرخیز ذہنوں کی پیداوار انہی کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ مگر یہ توقعات تب پوری ہوں گی جب مناسب تعلیم وتربیت کے علاوہ ان کو معاشی لحاظ سے بھی آسودہ حالی میسر آئے گی۔ معاشرے میں ان کے مقام ومرتبے کا احساس وادراک ہوگا۔ لوگ تعلیم وتعلم کے آداب سے واقف ہوں گے۔ ان تمام ضرورتوں کی تکمیل کے لیے قرآن حکیم کی طرف بحیثیت ایک قوم ہماری مراجعت ضروری ہے۔ اس میں صنعت وحرفت کی قدردانی سمیت جملہ علوم وفنون کے اسرار ورموز پوشیدہ ہیں۔ نئی زندگی کی جملہ ضروریات کا متوازن اور معتدل حل اسی کے اندر ہے۔ بایں طور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ یہ آخری کتاب حیاتِ اجتماعی کے لیے حل مشکلات کے معاملے میں حرفِ آخر ہے۔ حیات بخشی کی ضامن یہی اللہ کی کتاب قرآن مجید فرقان حمید مسلمانوں کے لیے واحد نصابی اساس ہے۔ یہ اس زیرنظر مقالے کے کچھ محوری نکات ہیں۔

ضرورت ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں قوم کی تعمیر وسربلندی کے حامل ان رہنما خطوط اور ان کی افادیت وناگزیریت کا از سرنو جائزہ لیا جائے۔ حتیٰ کہ قرآن فہمی کے عمل میں نئے حالات میں نئے پہلوؤں پر نئے تفسیری نکات اٹھائے جائیں اور ذرا تفصیل کے ساتھ مختلف جہات پر گفتگو کرتے ہوئے قرآن حکیم کے تعلیم کردہ تعلیم وتعلم کے انداز وآداب کو اس سے اخذ کر کے منظر عام پر لایا جائے۔ زیرنظر مقالہ اسی سمت میں پیش قدمی کی ایک کوشش ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں پڑھانے اور علم سکھانے والے کی فضیلت وعظمت اور برتری وبزرگی کو اس قدر شاندار انداز میں بیان کیا ہے کہ اس کی کہیں کوئی نظیر نہیں ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علم وآگہی اور شعور وبصیرت کے زیور سے آراستہ قومیں ہی جادہ مستقیم پر استقامت اور پامردی کے ساتھ پیش قدمی کرتی ہیں۔ اور روئے زمیں پر اپنے ہونے کے انمٹ نقوش چھوڑ کر تاریخ میں ایک اونچا مقام حاصل کرتی ہیں۔ اسی لیے بے علمی وناخواندگی اور کم علمی وجہالت کے خاتمہ کی جدوجہد کو قرآن حکیم نے ''جہادِ کبیر'' کا نام دیا ہے۔ اور یہ وہ جہاد ہے جو آغازِ اسلام کے ساتھ یعنی ابتدا ہی سے لازم وواجب ہو گیا تھا۔ اس کے لزوم ووجوب کے تعلق سے فرمان باری تعالیٰ ہے:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا. (الفرقان: ۵۲)

ترجمہ: تو آپ منکرین کی اطاعت مت کیجیے اور ان کے ساتھ اس قرآن کے ذریعے جہاد کبیر کیجیے۔

سورۂ فرقان مکی سورہ مبارکہ ہے۔ اور گو مفسرین کرام اس کے زمانۂ نزول کی صحیح تعیین کے سلسلے میں خاموش ہیں۔ مگر اس کے مضامین عندیہ دیتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں قرآن حکیم کا کچھ ابتدائی حصہ نازل ہو چکا تھا جب اس کا نزول ہوا۔ اس لیے کہ اس میں ایک طرف یہ حکم ہے کہ کفار ومشرکین کے مزاحمانہ رویوں کی پرواہ کیے بغیر ان کے اندر سے بے علمی وناخواندگی، کم عقلی ونادانی اور کم علمی وجہالت کو دور کرنے کے لیے پوری تندہی کے ساتھ اقدامات کیے جائیں۔ پھر اسی سورہ مبارکہ کی آخری آیات میں عباد الرحمٰن کے مثالی سیرت وکردار کو خلق خدا کے سامنے فخریہ پیش کیا گیا ہے۔ بایں طور کہ یہ ہے قرآن حکیم کے زیرسایہ پروان چڑھنے والے بندگان خدا کی روش۔ گویا یہ فرق ہے بہرہ منداور بے بہرہ لوگوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درمیان۔ قرآن حکیم نے اس فرق کے ضمن میں ایک سادہ سا سوال اٹھایا ہے۔ اس سوال کا جواب تو بدیہی ہے مگر بہت گہری سوچ میں ڈال دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ.

(الزمر: ۹)

ترجمہ: (اے رسول مکرم) آپ سوال کیجیے: کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو علم نہیں رکھتے؟ نصیحت و عبرت تو صرف اور صرف فہم و دانش والے ہی اخذ کرتے ہیں۔

علم ایک نعمتِ خداداد ہے۔ اس کے مختلف درجے اور مرتبے ہیں۔ جو نیم خواندگی سے شروع ہو کر "اُولُوا الْاَلْبَاب" کے مقام تک بلند ہوتے ہیں اور پھر آگے "حِلْم" کے اعلیٰ و ارفع مقام سے ہمکنار ہیں۔ مگر کسی بھی مرحلے یا مرتبے کی پیمائش ممکن نہیں ہے۔ ایسے ہی جیسے خلا میں بلندی کا سفر بے علامات و نشانات ہوتا ہے۔ فہم و دانش، معاملہ فہمی اور بصیرت تک رسائی پیدا کیے بغیر ایک اچھے کردار کی تخلیق اور قیادت و سیادت کی ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہونا ناممکن ہے۔ عربی زبان و بیان کا تتبع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عقل و خرد کے ان کے ہاں مختلف درجات ہیں۔ عام لوگ عقل محض کے حامل ہیں۔ خاص خاص لوگ جو فہم و دانش کا خصوصی ملکہ رکھتے ہیں وہ "اُولُوا الْاَلْبَاب" کہلاتے ہیں۔ اور ان جملہ درجات پر جس درجے کا راج قائم ہے وہ "حِلْم" کہلاتا ہے۔ قحط الرجال کے اس دور کی اصل خرابی یہی ہے کہ علم تو عام ہے مگر حلم کا فقدان ہے۔

یہاں اضافی طور پر یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے اور اگرچہ بات کسی حد تک زیرِ بحث موضوع سے ہٹ جاتی ہے مگر مناسبت اور افادہ سے خالی بھی نہیں ہے کہ راقم نے آیتِ مندرجہ بالا کا ترجمہ کرتے وقت عام روایت کی اتباع نہیں کی ہے۔ عام رواج کے مطابق مترجمین قرآن حکیم "اُولُوا الْاَلْبَاب" کا ترجمہ بھی "عقل والے"(۱) یا "عقلمند"(۲) ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ عقل خود عربی نژاد کلمہ ہے جو اپنے محل میں اپنا معنی بخوبی ادا کرتا ہے۔ اس مقام پر توجہ کی ضرورت ہے۔ "اَلْاَلْبَاب" جمع ہے: "اَللُّبّ" کی۔ اور عربی میں "اَللُّبّ" کہتے ہیں: "خلاصے" اور "نچوڑ" کو۔ بلیاوی لکھتے ہیں:

"اَللُّبّ": ہر چیز کا خالص۔ خالص عقل جو وہم وغیرہ کی آمیزش سے پاک ہو۔ یا تیز فہمی۔ اس لیے "لُبّ" پر عقل کا اطلاق ہوگا مگر عقل پر "لُبّ" کا اطلاق ضروری نہیں۔ (۳)

ایسے ہی جیسے کسی کی تعلیمی قابلیت جب ایم اے بیان کی جاتی ہے تو میٹرک سمیت نچلے تمام درجات شامل ہوتے ہیں۔ مگر میٹرک کہہ کر ایم اے مراد لینے کی گنجائش کوئی نہیں ہے۔ اس لیے عقل کے اس درجہ خاص کو درجہ عام کے مختص الفاظ سے تعبیر کرنا بھی موزوں و مناسب نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن حکیم جب یہ کلمہ استعمال کرتا ہے تو اس سے عقل عام مراد نہیں لیتا۔ عقل عام بنیادی طور پر عقل خام ہے۔ بلکہ قرآن حکیم کی مراد ہوتی ہے تمام عقلوں کا خلاصہ و نچوڑ یا فہم و دانائی کا عرق۔ جو عام ہے وہ خام ہے۔ یہ خواص کا مقام ہے۔ صرف چیدہ چیدہ لوگوں کو ہی یہاں تک رسائی نصیب ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر عقل عامۃ الناس میں بٹی ہوئی ہے۔ ''اُولُوا الْاَلْبَاب ''، عقل و خرد کے اس بلند درجے کے وارث ہیں جو عام نہیں ہے۔ اور جو درجہ اخص الخواص کے حصے میں آیا اسے ''حِلْم'' کا نام دیا گیا ہے۔

عربوں کے عہدِ جاہلی اور بعد ازیں عہدِ رسالت میں بھی لفظ ''حِلْم'' دانشوریت یا معاملہ فہمی و دانائی کے معنوں میں مستعمل رہا ہے۔ اس لفظ کا ترجمہ عام طور پر بردباری کیا جاتا ہے۔ بردباری ایک جداگانہ کیفیت ہے جو اس مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر ہے۔ خود اس کے لیے تحمل کا لفظ موضوع ہے۔ عامر بن ظرب کی عربوں میں جو شہرت اور عظمت ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ عرب اس کو فہم و دانش کا پیکرِ مجسم خیال کرتے تھے۔ اس بنا پر اس کو '' ذُو الْحِلْمِ ''(۴) (حلم والا، دانشور، دیدہ وَر) کے خصوصی لقب سے ملقب کیا کرتے تھے۔

اَلْفَنْدُ الزِّمَّانِيّ جنگِ بَسُوس کے پس منظر میں کہتا ہے:

وَ بَعْضُ الْحِلْمِ عِنْدَ الْجَهْلِ لِلذِّلَّةِ اِذْعَانٌ وَ فِي الشَّرِّ نَجَاةٌ حِيْنَ لَا يُنْجِيْكَ اِحْسَانٌ (۵)

ترجمہ: بسا اوقات ''جہالت'' (غیر دانشمندی) کے مقابلے پر ''حِلْم'' (دانشوریت) کا مظاہرہ ذلت کی اطاعت اختیار کر لینے کے مترادف عمل ہوتا ہے، اور نجات برائی میں ہی سمٹ آتی ہے جب احسان کر کے بھی تمہیں چھٹکارا اور نجات نہ مل سکے۔

اسی طرح معبد بن علقمہ کا شعر ہے:

وَ تَجْهَلُ اَيْدِيْنَا وَ يَحْلُمُ رَأْيُنَا وَ نَشْتِمُ بِالْاَفْعَالِ لَا بِالتَّكَلُّمِ (۶)

ترجمہ: ہمارے ہاتھ جہالت کا مظاہرہ کر جایا کرتے ہیں اور ہماری رائے البتہ دانشورانہ (معاملہ فہمی اور دانائی پر مبنی) ہی ہوتی ہے، ہم زبان سے نہیں بلکہ اپنے افعال سے گالی کا جواب دیا کرتے ہیں۔

اور قرآن حکیم کے متعدد مقامات میں سے ایک یہ ہے:

اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (الطور: ۳۲)

ترجمہ: کیا ان کی دانشوری انہیں یہی کچھ سکھاتی ہے بلکہ یہ تو ہیں ہی سرکش لوگ۔

عہدِ جاہلی کے ادبی ذخیرے کے علاوہ خود قرآن حکیم سے بھی یہ بات واضح ہے کہ ''حِلْم'' مجرد عقل کے مقابلے میں اعلیٰ و ارفع نوعیت کے فہم و بصیرت اور دانشوریت کے مفہوم کی ادائیگی کے لیے موضوع کلمہ ہے۔ اس بنیادی اصطلاح کے اپنے معانی سے ہٹ جانے کے باعث جو خلا پیدا ہوا اس کو پر کرنے کے لیے ہمارے دانشور نئی تجاویز لے کر آرہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ڈاکٹر فضل الرحمٰن لکھتے ہیں:

''اسلامی تعلیم سے میری مراد مادی قسم کا ساز وسامان اور تدریسی اسباب، مثلاً پڑھائی جانے والی کتابیں یا تعلیم کا ظاہری ڈھانچا نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ چیز ہے جسے میں ''اسلامی دانشوریت'' (Islamic intellectualism) کہتا ہوں''(۷)

ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جس اسلامی دانشوریت کی بات کی ہے اس کا پایہ اسلامی سمجھ وشعور (Wisdom of Islam) سے خاصا بلند ہے۔اور اس مفہوم کو ادا کرنے کا اصل حقدار اور وارث ''حِلم'' ہی ہے۔لہٰذا کیا ہی اچھا ہو اگر اس کلمہ کو اپنے حقیقی معنی ومفہوم کے ساتھ ایک نئی زندگی دے دی جائے۔اضافی فائدہ یہ ہو گا کہ قرآن وحدیث میں جہاں جہاں یہ کلمہ استعمال ہوا ہے، فہم معانی کے عمل میں، ایک نئی مگر حقیقت سے پیوستہ جہت تک رسائی کی صورت بھی پیدا ہو جائے گی۔ایسے ہی دیگر اصطلاحات، جو اپنے اصل معنی ومفہوم سے کسی قدر ہٹ چکی ہیں، نئی زندگی کی متمنی ومتقاضی ہیں اور ہماری نئی زندگی بھی ان کے احیا کے ساتھ مشروط نظر آتی ہے۔

اساتذہ کرام ہی ہیں جو علم وہنر کی یہ نعمت اور دولت تقسیم کرتے ہیں اور ''حِـلم'' کے اعلیٰ وارفع مقام کی جانب رہنمائی کرتے ہیں۔لہٰذا قوم کا یہی وہ جوہر کامل ہے جو قوم کے افراد کے فکر وعمل کے زاویوں کو صحت مند رجحانات سے آشنا کر کے دراصل قوم کی تعمیر وتشکیل کا مقدس فریضہ سرانجام دیتا ہے۔کارزارِ حیات میں وہ قوم کبھی مات نہیں کھا سکتی جس کے اساتذہ مخلص ومحنتی اور اپنی قوم سے وفادار ہوں اور جس قوم میں اساتذہ کا احترام پایا جائے۔اساتذہ حقیقی معنوں میں قوموں کے معمار ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں کی پیچیدہ صورتحال کی بنیادی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ اساتذہ کرام میں ابھی کم ہی لوگ ایسے ہیں کہ جن کو اپنی اس حیثیت اور نازک ذمہ داریوں کا پورا احساس وادراک حاصل ہے۔ ہمارے ماحول ومعاشرے میں پائی جانے والی یہ پیچیدگی دوطرفہ ہے۔نہ اساتذہ کے اندر اعتماد ہے اور نہ افرادِ قوم کے اندر احترام۔ اگر دیکھا جائے تو زیادہ قصور بہرحال اساتذہ برادری ہی کے حصے میں آئے گا۔کیونکہ قومی ذہن کی تشکیل نو کے ذمہ دار بنیادی طور پر یہی ہیں۔قوم کے اندر پائی جانے والی بے دلی وبداعتمادی کی اس فضا کی بادیُ النظر میں وجہ یہ نظر آتی ہے کہ اساتذہ کی ایک غالب اکثریت میں مناسب اہلیت واستعداد تربیت کا فقدان ہے۔حتیٰ کہ نصاب بنانے والے ادارے یہ سوچ کر پریشان ہو جاتے ہیں کہ حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ نصابِ تعلیم تو ترتیب دیں مگر اسے پڑھانے کے لیے درکار اہلیت کے حامل لوگ تعلیمی اداروں میں ہنوز موجود نہیں ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ استاذ کے اندر اگر صلاحیت ولیاقت موجود ہو تو ایک بے جان نصاب تعلیم کو بھی جاندار بنا دیتا ہے۔اور اگر مناسب اہلیت وتیاری نہ ہو تو نصابِ تعلیم کی خوبیاں کچھ نہیں کر سکتیں۔پھر یہ بھی ہے کہ سب حالات کے تقاضوں، اپنے مقام ومرتبہ اور ذمہ داریوں کی حساس نوعیت کا ادراک نہیں رکھتے۔دشواری یہ بھی ہے کہ انہی کے برابر پے اسکیل کے حامل انتظامی عہدوں پر فائز افراد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اوران کو دستیاب سہولیات واختیارات کو دیکھ کر بھی کچھ لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ کچھ لوگ مخالف ہواؤں کے بس ایک ہی جھونکے کے سامنے بے بس ہو کر اپنے آپ کو ایک عضوِ معطل سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ زہر ایسا ہے کہ پوری برادری کو اس کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ ایک عمیق تر نظر سے دیکھا جائے تو ایک استاذ کی اہمیت وفضیلت بہر اعتبار دوسروں سے، حتی کہ مسیحاؤں، جو زندگی کی حفاظت پر مامور ہیں، سے بھی زیادہ ہے۔ اُس طرف ماہ وسال کے ایک محدود پیانے میں محصولات ومفادات کا سارا زور سمٹ آیا ہے تو اس کی چمک بڑھ گئی ہے۔ جبکہ ایک معلم اور اس کی زندگی بھر کی کمائی ایک بہت بڑے کینوس پر بکھری گئی ہے۔ اُدھر فوائد وثمرات ایک محدود مدت کے لیے ہیں۔ یہاں گراں مایہ صدقۂ جاریہ ہے جس میں اضافہ روز افزوں ہے۔ حتی کہ اخیر عمر میں یا پھر ایک استاذ کی حیات جب اپنا دامن سمیٹ لیتی ہے تو فوائد وثمرات کا تانتا سا بندھ جاتا ہے۔ مگر بات تو جب ہے کہ جہاں اس کا آخری ٹھکانہ بنے وہ مٹی بھی خوشبو دینے لگ جائے۔ اور یہ تبھی ممکن ہے جب ایک کامل احساس وادراک کے ساتھ دشتِ تعلیم وتعلم کی سیر کرتے ہوئے یہ عمر عزیز گزر جائے۔

ایک استاذ ایک مسلمہ دائمی وعالمی انسانی قدر کے طور پر روحانی باپ کا درجہ اور مقام رکھتا ہے۔ لہٰذا اساتذہ کرام کو اپنے مقام ومنصب کی عظمت ورفعت کا احساس وادراک ہی نہیں کامل یقین بھی کرنا ہوگا۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر اس کے اثرات کے طور پر چند برسوں میں دیگر لوگوں کے رویوں میں تبدیلی نظر آنے لگ جائے گی۔ مذکورہ بالا مراعاتی تقابل کے تعلق سے اپنی عمومی معاشرتی زندگی پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔ کئی مثالیں ملیں گی۔ ہم اس کی یہ مثال بھی دے سکتے ہیں کہ ایک باپ اگر اپنی حینِ حیات میں نسبتاً ایک چھوٹے منصب سے منسلک رہا ہو۔ مگر مقدور بھر کوشش سے اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلاتا ہے جس کی بدولت وہ اولاد بلند ترین مناصب ومقامات تک جا پہنچتی ہے۔ لوگوں میں عزت واحترام حاصل کر لیتی ہے اور گونا گوں فوائد وثمرات سمیٹ کر آسودہ حال ہو جاتی ہے تو کیا کوئی سلیم العقل انسان یہ سوچ سکتا ہے کہ باپ کا رتبہ کم کر دے۔ ہرگز نہیں۔ اولاد خواہ کتنی ہی ترقی کی منازل طے کر لے قدرت نے باپ کو جو عظمت عطا کی ہے اس کے آگے اولاد کا سر ہمیشہ خم ہی رہے گا اور رہنا بھی چاہیے۔ یہی سعادت مندی ہے اور معاملہ اگر خدانخواستہ اس کے برعکس ہو جاتا ہے تو نری بدبختی۔ یہی حال روحانی باپ کا بھی ہے۔ بڑے بڑے عہدوں پر چمکنے والے ہیرے دراصل انہی کے ہنر مند ہاتھوں کے تراشیدہ ہیں۔

اس لیے ایک استاذ کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ دیگر امور سے توجہ ہٹا کر مطالعہ اور تحقیق وجستجو کا عمل اپنے حینِ حیات تک جاری وساری رکھے۔ حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ اگر کبھی حالات کی ناسازگاری اس معاملے میں تعطل پیدا کر دے تو بھی اس کا دھیان اِدھر ہی رہے اور جیسے ہی حالات سازگار ہوں دوبارہ اپنے پیشہ وارنہ معمولات کی طرف متوجہ ہو جائے۔ حدیث شریف میں آتا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ وَ اِنَّمَا الْحِلْمُ بِالتَّحَلُّمِ. (۸)

ترجمہ: "عِلْم"، صرف سیکھتے رہنے سے ہی ہاتھ آتا ہے اور "حِلْم" (دانشوریت، معاملہ فہمی و دانائی) صرف دیدہ ور بننے کی لگن سے ہی ملتی ہے۔

تجربات شاہد ہیں کہ ایک استاذ کے مطالعہ و تحقیق کے عمل میں جب تعطل واقع ہوتا ہے تو اس کی معلومات تازہ دم اور صحتمند نہیں رہ پاتیں۔ یہ چیز استاذ کے رویے اور طرزِ عمل کو براہِ راست متاثر کرتی ہے۔ پھر آگے چل کر استاذ اور شاگرد کے باہمی روابط بھی انہی رویوں کے باعث متاثر ہوتے ہیں۔ اور بالعموم تعلیم و تعلّم کا عمل بھی اس نوع کی بداعتمادی کی فضا کے باعث مفلوج ہو کر غیر معیاری اور غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ اپنائیت اور شفقت ایک استاذ کا طرۂ امتیاز ہے۔ تمام طلبہ اپنی روحانی اولاد اور اپنے بچوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ دھتکار پھٹکار کسی بھی طرح ایک استاذ کے شایان شان نہیں۔ حضور رسالت مآب ﷺ کی شان شفقت و محبت کو اللہ رب ذوالجلال نے اپنی خصوصی رحمت سے تعبیر فرمایا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ. (آل عمران:۱۵۹)

ترجمہ: تو یہ اللہ کی رحمت کے طفیل ہی ہے کہ آپ ان لوگوں کے لیے نرم خو ہو گئے اور اگر آپ درشت خو سخت دل ہوتے تو یقیناً یہ لوگ آپ کے گرد و پیش سے چھٹ جاتے تو آپ ان سے درگزر فرماتے رہیں اور ان کے لیے استغفار کرتے رہیں اور اہم معاملے میں ان سے رائے لیا کریں پھر جب آپ پکا ارادہ فرمالیں تو پھر اللہ پر بھروسہ رکھیں، یقیناً اللہ بھروسہ کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

حوصلہ افزائی کے بغیر استاذ و شاگرد کے مابین رشتہ زیادہ وثوق پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اہم معاملات میں اپنے طلبہ سے رائے ضرور لینی چاہیے۔ مگر اس شرط پر کہ ان کی رائے کی کمزوری یا زبان لڑکھڑا جانے پر دیگر ہم جماعت قہقہے لگانے یا طنز و طعن کی زبان استعمال کرنے کے معاملے میں آزاد نہ ہوں۔ سنجیدگی، وقار اور متانت کو سب پر لازم کر دیا جائے۔ کسی کی کوتاہی فکر و عمل اس کی عزتِ نفس کو پامال کرنے یا اسے صدمہ پہنچانے کا بہانہ نہ بننے دی جائے۔ ماحول ساز گار اور حوصلہ بخش رہے تو انہی غلطیوں سے سبق سیکھ کر یہ طلبہ دیدہ ور بننے کی بھی اہلیت رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو اسی طرح کے حالات کا سامنا کرنے کے بعد اپنا ایسا مقام بناتے ہیں کہ جن پر انسانی کردار و عمل کی عظمتیں بجا طور پر ناز کر سکتی ہیں۔ چھوٹوں کے تجربات کم اور غلطیوں کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ ہر چھوٹی بڑی غلطی قابل گرفت نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہر غلطی سے صرفِ نظر بھی ممکن نہیں ہوتا۔ یہی سب سے بڑا امتحان ہے ایک استاذ کے لیے کہ پوری طرح سنبھل کر ایسا فیصلہ کرے جو بڑے پن اور دانشمندی کا مرقع ہو۔ اور اگر کسی کو سرزنش ناگزیر ہو جائے تو اتنا تو بہر طور ضروری ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسے تماشا بنا کر دیگر ہم جماعت طلبہ کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دیا جائے۔ اس سے نو خیز طلبہ کا مان ٹوٹتا ہے اور عملی زندگی میں وہ کوئی بھی کام حوصلہ مندی کے ساتھ کرنے کے لائق نہیں رہتے۔ یہی ہمارا حقیقی سرمایہ ہیں اور یہی ہماری حقیقی متاعِ حیات ہیں۔ ان کے معاملے میں رویوں کی بے اعتدالیاں اور بے احتیاطیاں بہت کچھ ڈبو دیتی ہیں۔ بہت مرتبہ تو یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ متاعِ زیست تو فنا ہو چکی ہوتی ہے اور خالی ڈبے کی مانند فقط ایک ڈھانچہ گردش میں رہتا ہے۔ بقول پروین شاکر

یہ سر اٹھائیں کیا انہیں کسی پہ مان ہی نہیں　　کسی کا پیار ان کے حوصلوں کی جان ہی نہیں

استاذ کی اپنے منصب اور اپنے مشن کے ساتھ بھرپور وابستگی بھی ضروری ہے۔ طلبہ کی کامیابی اور ناکامی استاذ ہی کے کھاتے میں جاتی ہے۔ بھرپور وابستگی کے باوجود اگر کچھ لوگ استفادہ نہیں کر پاتے تو اور بات ہے۔ اس صورت میں استاذ کے سر الزام نہیں ہے۔ حضور رسول مکرم ﷺ کی اسی بھرپور وابستگی کا قرآن حکیم میں بایں طور اعتراف کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا۔(الکھف: ٦)

ترجمہ: تو لگتا ہے کہ اگر یہ لوگ اس قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے تو آپ ان کے پیچھے اسی غم میں جی جاں سے گزر جائیں گے۔

خیر خواہی و ہمدردی کا جذبہ اور تعلق خاطر اس حد تک قوی ہو تو نتائج کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ بنیاد اگر راست ہو تو نتائج یقیناً اچھے ہی برآمد ہوں گے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وقتی طور پر نتائج کا ظاہر حوصلہ افزا نظر نہیں آتا مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بھلائی صرف خیر پر ہی منتج ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ عزوجل نے سکھانے کے عمل کی نسبت قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر خود اپنی جانب فرمائی ہے۔ اس صراحت کے حامل ارشادات پورے قرآن حکیم میں بہت سی جگہوں پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ چند منتخب آیات ملاحظہ کیجیے:

۱) وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا. (البقرہ: ٣١)

ترجمہ: اور اس (اللہ تعالیٰ) نے آدم کو سارے کے سارے نام سکھا دیے۔

۲) وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ. (النسآء: ١١٣)

ترجمہ: اور (اے رسول مکرم!) اللہ نے تمہارے اوپر کتاب و حکمت نازل کی اور اس نے تمہیں وہ کچھ سکھایا جسے تم خود سے جاننے کے نہ تھے۔

۳) اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ o عَلَّمَهُ الْبَیَانَ o (الرحمن: ١ تا ٤)

ترجمہ: وہ نہایت مہربان ہے۔ جس نے قرآن سکھایا ہے۔ جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اسی نے اسے بولنا سکھایا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴) اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ. (العلق: ۴و۵)

ترجمہ: وہ عظیم ذات جس نے قلم کے ذریعے سکھایا۔ اسی نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے یہ نہیں جانتا تھا۔

اور حضور رسالت مآب ﷺ کی بھی یہی شان ہے کہ آپ ﷺ بھی ایک معلم بن کر تشریف لائے ہیں۔ لٰہذا تعلیم دینے اور سکھانے کا عمل، جسے عام طور پر پیشہ ' درس و تدریس سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، کی عظمت و رفعت کو بیان کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ اللہ جل جلالہ خود بھی مُعَلِّمْ ہے۔ اور اس ذاتِ تعالیٰ نے رسول مکرم و معظم کو بھی مُعَلِّمْ ہی بنا کر بھیجا ہے۔ قرآن حکیم میں اس امر کی متعدد مقامات پر صراحت ملتی ہے۔ نبی آخر الزماں ﷺ نبی موعود ہیں۔ آپ ﷺ کی بعثت کے لیے خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا حسب ذیل کلمات پر مبنی و مشتمل ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَیُزَکِّیْهِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ. (بقرہ: ۱۲۹)

ترجمہ: ''اے ہمارے پروردگار! ان میں انہی میں سے ایک عالی شان رسول بھیج جو ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انہیں پاکیزہ بنا دے۔ یقیناً تو ہی عزیز و حکیم ہے''

اللہ کی آیات تلاوت کرنا، کتاب و حکمت کی تعلیم دینا اور لوگوں کا تزکیۂ نفس کرنا، اس دعا کی روشنی میں، آپ ﷺ کی بعثت مبارکہ کے بنیادی مقاصد قرار پاتے ہیں۔ اثرِ دعاء کی مظہر آیتِ کریمہ سے بھی انہی باتوں کی توثیق ہوتی ہے۔ بلاشبہ یہ تمام امور آپ ﷺ کی معلمانہ عظمت و شان ہی کے آئینہ دار ہیں۔ اثرِ دعا ملاحظہ فرمائیے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ. (آلِ عمران: ۱۶۴)

ترجمہ: ''یقیناً بڑا احسان فرمایا ہے اللہ نے اہل ایمان پر کہ ان میں انہی میں سے ایک عالی شان رسول بھیجا جو ان پر اُس کی آیات تلاوت فرماتا، انہیں پاکیزہ بناتا اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ یقیناً وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے''

آپ ﷺ کی صورتِ مبارکہ میں یہی دعائے خلیل جب متشکل ہوگئی تو اس امر کا بارگاہِ حق سے حسبِ ذیل کلمات میں اظہار و اعلان ہوا:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ. (سورہ جمعہ، آیت: ۲)

ترجمہ: ''وہ اللہ ہی ہے جس نے اِن غیر اہل کتاب لوگوں میں انہی میں سے ایک عالیشان رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیات تلاوت فرماتا ہے اور ان کو پاکیزہ بناتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور یقیناً اس سے قبل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھنے والوں کے لیے تو سکھانے اور تعلیم دینے کے عمل کے تقدس و رفعت شان کی اس سے بڑی دلیل اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس عمل کی نسبت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے ساتھ قائم ہے۔

قرآن حکیم نے ایک طرف معلم، علم اور تعلیم کی عظمت و رفعتِ شان کا نقشہ بہت عمدگی اور خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ دوسری طرف شخصی و اجتماعی ہر دو لحاظ سے تعمیر و تشکیل ذہنی اور تہذیب و اصلاح نفوس و افکار کے جملہ طریقے اور قرینے بھی قرآن حکیم میں سمو دیے گئے ہیں۔ ٹھوکر کھا کر سنبھلنے اور زوال و پس روی کا صدمہ سہنے کے بعد کھلنے والی آنکھ بہت محتاط ہوتی ہے اور صحیح معنوں میں زیرک و دانا ہوتی ہے۔ اپنی ضرورتوں اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ بہت احتیاط سے لیا کرتی ہے۔ ضرر و فساد کی راہوں پر بندشیں کھڑی کرنے اور تعمیر و ارتقاء کے در کھولنے والے عوامل کی شناخت بہت دیکھ بھال کر کی جاتی ہے۔ ان جملہ عوامل، محرکات کو راست سمت میں متحرک کرنے کا خوشگوار فریضہ بہر حال اساتذہ برادری ہی کے سپرد ہے۔

سورۂ کہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک علمی سفر کے چیدہ چیدہ حالات بیان ہوئے ہیں۔ یہ واقعہ اپنی جگہ سبق آموز تو ہے ہی قرآن حکیم کے اعجاز بیاں کی ایک روشن مثال بھی ہے۔ اس مقام پر قابل غور پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ اور پر جوش رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک ایسے شخص کا پتا ''دو دریاؤں کا سنگھم'' بتایا ہے جس کے پاس علم و حکمت کی نعمتِ خداداد ہے۔ آپ علیہ السلام یہ علم حاصل کرنے کی خاطر گھر سے نکلتے ہیں۔ اور اس بندۂ خدا کی تلاش میں چل پڑتے ہیں۔ عازمِ سفر ہونے سے قبل آپ علیہ السلام نے جن الفاظ میں اپنے اس ارادے پر حصول مقصد تک استقامت کا مظاہرہ کرنے کا عہد باندھا اور اپنے مصمم ارادے کا اظہار فرمایا تھا، قرآن حکیم نے اسے یوں نقل کیا ہے:

لَا اَبۡرَحُ حَتّٰۤی اَبۡلُغَ مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَیۡنِ اَوۡ اَمۡضِیَ حُقُبًا۔ (کہف : ٦٠)

ترجمہ: میں اپنا سفر جاری و ساری ہی رکھوں گا تا آنکہ دو دریاؤں کے سنگھم پہ جا ملوں، یا پھر مدتوں اس آرزو کی تکمیل میں ہی لگا رہوں گا۔

حضرت موسیٰ علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام ایک اولوالعزم رسول اور اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ بندے ہیں۔ آپ کا شمار قوم بنی اسرائیل کے جلیل القدر انبیاء میں ہوتا ہے۔ قرآن مجید آپ کا اور آپ کی ضدی، ہٹیلی اور حجتی قوم کا بکثرت ذکر کرتا ہے۔ اس قوم کی یہ حالت مصائب و آلام اور دقتوں و دشواریوں پر مبنی ماحول میں ظالم قوتوں کے خلاف بلا کسی عملی مزاحمت یا تبدیلئ حالات کی کسی کوشش کے بس جیسے چلے جانے کا طبعی نتیجہ تھی۔ مگر ایک ایسے وقت جب فراعنۂ مصر کے ہاتھوں قوم بنی اسرائیل پر ایک سخت مشکل اور کڑا وقت آن پڑا تھا، آپ علیہ السلام، قدرت کی طرف سے نجات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دہندہ بن کر سامنے آئے۔ قرآن مجید کا بیان ہے:

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۚ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۔ (بقرہ: ۴۹)

ترجمہ: اور یاد کیجئے وہ وقت جب ہم نے تم کو آل فرعون کی غلامی سے نجات دی۔ وہ تمہیں بدترین اذیتیں دیتے رہتے تھے۔ اور تمہارے لڑکوں کو ذبح کر دیا کرتے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رہنے کو چھوڑ دیتے تھے۔ اور تمہاری یہ حالت تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی۔

اس مصیبت میں پھنسی اور مشکل بھنور میں گھری ہوئی قوم بنی اسرائیل کی کشتی کو بحفاظت ساحل بقاء تک لیجانے کیلئے اور فرعون وقت کا غرور توڑنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو قوم بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ ایک پراگندہ طبع اور بگڑی ہوئی اور اس پر بھی مستزاد یہ کہ ہر معاملے میں حجت بازی، ضد اور ہٹ دھرمی کی عادی قوم، جو اپنے پاداش عمل کی سزا بھگت رہی ہو، کو راہ راست پہ لانے کیلئے کس قدر محنت، جانفشانی اور عزم و حوصلے کی پختگی درکار ہوگی؟ یہ اندازہ کرنا زیادہ دشوار نہیں۔ چونکہی لڑائی لڑنے کے مترادف عمل تھا۔ وسائل حیات پر فراعنہ مصر کا مکمل قبضہ تھا جبکہ مسائل حیات سب بنی اسرائیل کے حصے میں آئے تھے۔ دشمن تھا کہ بے حد طاقتور اور بے رحم ظالم۔ اور آپ کی قوم ہے کہ سمجھنے، سر اٹھانے اور ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہے۔ بلا ضرورت بلکہ سختیوں کو دعوت دینے والی ضد بحث ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وقت نازک تھا اور مہلت کم تھی۔ بایں ہمہ اپنی طبع پر جوش کو قابو کیے رہنا مشکل ترین عمل تھا۔ اسی غرض سے مختلف اور مشکل حالات کا پیشگی سامنا کرنے کے بعد اس مقدس فرض پر مامور ہوئے تھے۔ قرآن مجید میں اس قدر کثرت سے حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کی وجہ بھی یہی باور ہوتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے خود بھی بے پناہ مشقتوں کا خندہ پیشانی کے ساتھ سامنا کیا تھا اور آپ کو بھی ایک ایسی قوم کا سامنا تھا جو کئی اعتبار سے ان کے مشابہ تھی اور جس کا ماضی و حال عہد جاہلیت کہلاتا تھا۔ ان دونوں قوموں کی جملہ عادات و خصائل اور کیفیات و احوال کے مطالعہ کے دوران متذکرہ بالا دعائے خلیل علیہ السلام اور جواب و اثر دعا کو نگاہ میں رکھ کر سوچا جائے تو ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ اللہ کا ہر پیغمبر بنیادی طور پر ایک معلم ہوتا ہے اور بات یہ ہے تو اس امر میں بھی کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ معلمی بھی پیغمبری ہی کا ایک خالص پرتو ہے۔

اب قرآن مجید کے اسلوب بیان کا یہ پہلو ملاحظہ فرمائیں کہ ایک طرف ایک عظیم المرتبت اور جلیل القدر پیغمبر کو ایک طالب علم کے روپ میں پیش کرتا ہے جو اپنے استاذ کے سامنے ایک پیکر عجز و نیاز نظر آتا ہے۔ اس حد تک کہ ایک موقع پر تو علم کے اس طالب کو اس کا استاذ اچھی طرح سے اس کی علمی اوقات تک یاد دلا دیتا ہے (۹) دوسری طرف اس عظیم پیغمبر کو اس کی اوقات جتانے والا یہ محترم استاذ ہے کون؟ قرآن مجید، جس کے اسلوب بیان کی اساس اختصار و جامعیت پر قائم ہے، اس واقعہ کو بائیس آیات تک طول دے دیتا ہے مگر پھر بھی نام کا ذکر نہیں کرتا۔ اگرچہ یہ بھی اس واقعہ کے خاص خاص

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہلو ہیں۔ ایک کہانی کا سا تسلسل اور تواتر ان میں بھی نہیں ہے۔ مگر یہ بات قابل غور ہے کہ ان بائیس آیات میں اس مرد خدا کا کہیں نام تک نہیں لیا گیا۔ نہ ہی کوئی ایسا اشارہ یا قرینہ ملتا ہے جس سے اس مرد خدا کی ذات وشخصیت پر روشنی پڑتی ہو یا کھوج ہی لگایا جا سکتا ہو۔ بس اتنا کہا گیا ''عبدًا من عبادنا'' (۱۰) یعنی ''میرے بندوں میں سے ایک بندہ''۔ پیغام جو مضمر ہے اسے یوں تعبیری جامہ دیا جا سکتا ہے کہ پیڑ گننا ہر جگہ موزوں نہیں ہوتا۔ وقت مناسب دیکھ کر یہ طے کر لینا ضروری ہو جاتا ہے کہ فقط پھل کھانے سے مطلب رکھا جائے، پیڑ گننے سے نہیں؟ مگر اس موقع پر یہی کام نہیں ہو سکا۔ اور اگر کسی جگہ یہ گمان ہوتا ہے تو بھی اسے کوشش نا تمام سے زیادہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اہل علم اس بندہ خدا کے نام کی کھوج میں نکل پڑے ہیں۔ اسی سمت نہیں جانا تھا۔ نکلے تو احادیث وآثار پر مشتمل کتب میں منقول روایات (۱۱) سے پتا چلا کہ اس بندۂ خدا کو ''خضر'' کا نام دیا گیا ہے۔ مگر آپ نبی ہیں یا کوئی ولی؟ ایک نئی بحث چھڑ گئی اور بات الجھ گئی۔ مثلاً صاحب ضیاء القرآن فرماتے ہیں: ''آپ کو نبی ماننا پڑے گا'' (۱۲) گویا کہ یہ بھی ایک مجبوری سی بن گئی ہے کہ اس بندۂ خدا کو نبی مان لیا جائے۔ صاحبِ تدبر قرآن لکھتے ہیں:

حضرت خضر علیہ السلام بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی تھے۔ اس کا اول قرینہ تو یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر نبی بلکہ رسول کو ان کے پاس حصول علم اور حصول تربیت کے لیے بھیجا گیا۔ اگر حضرت خضرؑ نبی نہیں تھے تو ایک نبی کا غیر نبی کے پاس حصول علم وتربیت کے لیے بھیجا جانا بالکل ناموزوں سی بات ہے۔ (۱۳)

اصل بات یہ ہے کہ ایک جلیل القدر رسول خدا پر کسی غیر نبی کا یہ تحکم، تفوق اور برتری، جس کی صراحتیں قرآن مجید میں وارد ہیں، تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر یہ صراحت جب قرآن حکیم میں وارد ہے تو فرار کی راہیں بھی از خود مسدود ہو گئیں۔ اس پیچیدگی سے بچنے کی دو ہی صورتیں ممکن تھیں۔ ایک تو یہ راستہ اختیار کیا گیا کہ اس واقعہ میں وارد نام ''موسیٰ'' سے مراد کوئی اور شخص لیا جائے جو کہ اصلاً غیر معروف ہو۔ اس طرح اس اشکال سے بچنے کی یہ ترکیب سوجھی کہ (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) کا رتبہ گھٹا کر دونوں شخصیات کو ہم پلہ یا کم سے کم قریب المراتب کر دیا جائے۔ فخر الدین رازی واقعہ میں بندۂ خدا کی برتری کے پہلوؤں کی طرف متوجہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وَهٰذِهِ الْكَلِمَاتُ تُقَوِّىْ قَوْلَ مَنْ يَّقُوْلُ: اِنَّ مُوْسٰى هٰذَا غَيْرُ مُوْسٰى صَاحِبِ التَّوْرَاةِ.

(١٤)

دوسری صورت یہ تھی کہ اور اگر کچھ نہیں ہو سکتا تو اس بندۂ خدا کا رتبہ بڑھا کر ہی مشکل آسان کر لی جائے۔ اس نقطۂ نظر کو جمہور کے ہاں پذیرائی مل گئی۔ وہ بندۂ خدا جنہیں محدثین ومفسرین اور صوفیاء کے ہاں ''خضر'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اگر واقعتاً نبی ہیں تو پھر تو خیر ہے۔ اور اگر ایسا نہیں تو بغیر کسی ٹھوس دلیل کے محض آثار وقرائن کی بنیاد پر کسی غیر نبی کی نبوت کا اقرار کر لینا اور اس پر اصرار کرنا کس قدر خطرناک عمل ہے؟ اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں ہے۔ کیونکہ نبوت ایک ایسا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منصب ہے جو اپنی ذات میں معین و مشخص ہے۔ مزید برآں نبی و رسول کے فرق کا لحاظ کیا جائے تو مشکل تو پھر بھی اپنی جگہ پر برقرار ہے۔ ایک نبی کی کسی رسول پر بالادستی چہ معنی دارد؟ سیوہاروی کے بقول:

جمہور کا قول یہ ہے کہ نہ وہ رسول تھے اور نہ فقط عبدِ صالح بلکہ ''نبی'' تھے۔ (۱۵)

سوال یہ ہے کہ قدرت خداوندی سے بعید کیا ہے؟ مگر اس پہلو پر مناسب دھیان ہی نہیں دیا گیا۔ چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ اسلامی تعلیمات میں جوڑا گیا یہ ایک ایسا پیوند ہے جسے ایک طرف سے جوڑتے ہیں تو دوسری طرف سے اُدھڑ جاتا ہے۔ ایک تیسرا اگرنسبتاً کمزور رجحان یہ بھی پایا گیا ہے کہ اس واقعہ کو حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ قبل از نبوت سے منسلک کر دیا جائے۔ (۱۶)

رہی بات حدیثِ جبریل میں مذکور واقعے کے ساتھ مشابہت کی یعنی یہ کہا جائے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس بندۂ خدا کی شکل میں متشکل ہو کر سامنے آئے ہوں تو اس بات کا کوئی قائل، کوشش بسیار کے باوجود، ہمیں نظر نہیں آیا۔ لہٰذا خارج از امکان خارج از بحث کے اصول کے تحت اس جانب توجہ نہیں دی گئی۔

حضرت خضر علیہ السلام کی ذات و شخصیت کے حوالے سے بہت سے گوشے ایسے ہیں جن پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اپنی تنگ دامانی کے باعث زیرِ نظر مضمون جداگانہ مزاج کی ان تفصیلات کا متحمل تو نہیں ہو سکتا۔ البتہ اتنا اظہار یقیناً سود مند ہوگا کہ اس تصور کے تانے بانے دراصل اسرائیلیات کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ صاحبِ تفسیر حقانی رقمطراز ہیں:

> ''گرچہ ملک صدق کی بابت جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں تھا اور جس کی نسبت ہمیشہ زندہ رہنا لکھا ہے اہل کتاب کے مختلف قول ہیں مگر صحیح تر یہی ہے کہ ملکِ صدق وہی شخص ہے، جس کو اہل اسلام خضر سے تعبیر کرتے ہیں'' (۱۷)

قاضی منصور پوری لکھتے ہیں:

> ''ملک صدق کے متعلق عیسائیوں کا عجیب اعتقاد ہے۔ پولوس عبرانیوں کا خط باب ۷ میں لکھتا ہے یہ بے باپ بے ماں بے نسب نامہ جس کے نہ دنوں کا شروع نہ زندگی کا اخیر۔ ہمیشہ کاہن ہی رہتا ہے۔ عیسائی اسے ازلی ابدی اور بے نسب نامہ ہونے میں خدا کے مشابہ بتاتے ہیں'' (۱۸)

بادیٔ النظر میں خضر کے نام سے معروف شخصیت دراصل ایک مافوق الفطرت ہستی کا اسطوری و افسانوی تصور ہے۔ یہ تصور از منہ قدیمہ سے اوہام کے تاریک گوشوں میں امید کی کرن بن کر رہتا چلا آیا ہے۔ اسے عہد نامہ قدیم میں ''ملکی صادِق'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور کاہن بالخصوص کاہن اعظم بھی کہلاتا ہے۔ مذہبی حلقوں میں جب پیشوائیت کا اثر و رسوخ گھٹنے لگ جاتا ہے تو بالعموم یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ اس نوع کے تصورات سے اس کو سہارا دیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتا ہے۔ عہد نامہ قدیم وجدید کے کچھ مقامات کے تتبع سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ کوئی ایسی ہستی ہے جس کا نہ آغاز ہے نہ انجام۔ نہ ماں نہ باپ۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے تصور کے بھی منافی ہے اور حد یہ کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ان سے برکت لیتے نظر آتے ہیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں نے اپنے نبی کو ملکی صادق کے رتبہ کا دائماً کاہن اعظم بنا کر دم لیا ہے۔ (۱۹)

لہٰذا ہم نشأۃ ثانیہ کے جس شروعاتی دور سے گزر رہے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ اہل علم ان روایات وتصورات اور خیالی وفرضی سہاروں کی اصلیت کی قلعی اب کھول دیں۔ تا کہ اصل حقائق کا چہرہ بے نقاب نظر آئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دقیق نظری کے ساتھ معروف ومشتہر روایات کی اصل حقیقت کا مطالعہ کیا جائے اور مناسب پیرائے میں ان مباحث کو منظر عام پر بھی لایا جائے۔ جب تک تمام روایات کا استقصاء اور ان پر دقیق نظری کے ساتھ غور کا عمل مکمل نہیں ہو جاتا، کمزور پہلوؤں کو نشانزد تو کیا جا سکتا، تحقیقی اسالیب کے منافی عمل ہوگا اگر حضرت خضر علیہ السلام کے تعلق سے کوئی حتمی مؤقف اختیار کر لیا جائے۔ بنا بریں زیر نظر مضمون میں ہم منقولہ روایات کی پیروی ہی کریں گے۔ امین احسن اصلاحی نے بھی اپنی تفسیر میں یہی طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''قرآن نے ان کا نام نہیں بتایا ہے۔ صرف ان کے بعض مخصوص اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ بعض حدیثوں میں ان کا نام خضر آیا ہے۔ چونکہ ان حدیثوں کے انکار کی کوئی وجہ ہمارے پاس نہیں ہے اس وجہ سے یہی نام ہم اختیار کر لیتے ہیں''۔ (۲۰)

قرآن مجید کو البتہ اس امر سے کوئی سروکار ہی نہیں کہ وہ بندۂ خدا کون تھا؟ اور کیا تھا؟ وہ جو بھی تھا، حکم ایزدی کے تحت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معلم اور استاذ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اس بندۂ خدا کے آگے زانوئے تلمذ تہ کر دیا تو دونوں کے مابین اب ایک استاذ اور شاگرد کا مقدس رشتہ قائم ہو گیا ہے۔ اور اسی مقدس رشتے نے ایک استاذ کے تحکم اور بالادستی کی راہ ہموار کر دی ہے۔ اس لمحے اگر یہ بتا دیا جاتا کہ وہ بندۂ خدا بھی کوئی ''نبی'' تھا یا ''ولی'' تھا یا جس طرح حدیث جبریل کی رو سے حضرت جبریل انسانی شکل میں متشکل ہو گئے تھے، کسی فرشتے سے یہ کام لیا گیا تھا تو اس کی شخصیت کا یہ پہلو تو یقیناً نکھر جاتا مگر اس قصے کو قرآن میں لانے کا اصل مقصد اور مفاد شاید ہاتھوں سے نکل جاتا۔ وہ یوں کہ اگر دونوں ہی ہم رتبہ افراد قرار پاتے ہیں تو یہ غیر معمولی سفر علمی، جس کی اہمیت وافادیت پر خود قرآن شاہدِ عدل ہے، معمول کی ایک عام سرگرمی شمار ہوتا۔ کیونکہ ہم پلہ افراد تو ایک دوسرے کی دسراتھ مانگتے ہیں۔ ساتھ ساتھ رہتے، ایک ساتھ چلتے پھرتے اور دوران سفر ایک دوسرے سے سیکھتے بھی ہیں اور سکھاتے بھی ہیں۔ لہٰذا یہ واقعہ کسی خاص توجہ اور پذیرائی کے لائق ہی نہ رہتا۔ اور اگر یہ کہا جاتا کہ وہ بندہ خدا اللہ کا کوئی ولی تھا تو بحث کا کوئی اور رخ اختیار کر لینا یقینی تھا۔ جیسا کہ بعض علماء کے ہاں ایسا ہوا بھی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ کیونکہ ایک برگزیدہ پیغمبر پر کسی غیر نبی کی بالادستی کا سنتے ہی اہلِ ایمان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یقیناً بے کل سے ہو جاتے اور اپنی ساری فکری توانائیاں، تاویلات ڈھونڈنے اور توجیہات پیش کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ یوں بھی اس قصے سے سیکھنے کا کوئی سبق ہی سیکھ پاتے نہ ان کا دھیان مقصودِ اصلی کی جانب ملتفت و متوجہ ہی ہو سکتا۔

قرآن حکیم نے اس واقعہ کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس اسلوبِ بیاں کے پیش نظر اسے یوں دیکھا جانا چاہیے کہ یہ واقعہ دراصل رتبہ معلمی کی عظمت کا ایک بے نظیر، قدرتی اور انمٹ نقش ہے۔ استاذ اگر صحیح معنوں میں استاذ ہے تو یہی اس کی عظمت کے ثبوت کے لیے کافی اور قطعی دلیل ہے۔ مزید کسی دلیل یا تفصیل کی حاجت ہی نہیں رہ جاتی۔ پیشہ تدریس کو ہم نے جتنا کچھ سمجھ رکھا ہے اس کا مقام و مرتبہ اور اس کی حقیقتیں اور تقاضے اس کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ قوموں کا حال اور مستقبل اساتذہ کی لیاقت و قابلیت ہی کا عکاس و آئینہ دار ہوتا ہے۔ ایسے ہی جیسے برتن میں جو چیز ہو وہی باہر آتی ہے۔ افرادِ قوم کی ذہن سازی جس انداز سے کی گئی ہے عملی دنیا میں اسی کے مجسم پیکر ملیں گے۔ لہٰذا ایک استاذ کا مقام و مرتبہ ہر اعتبار سے بڑا ہے۔ باقی تمام انسانی عہدے اور منصب اس کے آگے ہیچ ہیں۔

اتنا تو سبھی مانتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ جاؤ میرے فلاں بندے سے ملو! اس کے پاس اَور علم ہے۔ گویا جس ذاتِ اقدس نے نبوت و رسالت کا تاج آپ کے زیبِ سر کیا تھا اسی ذات نے آپ کے اوپر ایک وقت مقررہ کیلئے ایک معلم کا تقرر بھی فرما دیا۔ وہ خالق و مالک ہے۔ قادرِ مطلق اور احکم الحاکمین ہے۔ کسی کو منصبِ رسالت تفویض کر دے تو اس کے معاملے میں اس کا کوئی اختیار سلب نہیں ہو جاتا۔ یہ واقعہ اُس ذاتِ تقدس و تعالیٰ کی اسی قوت و قدرت کا ایک خوبصورت اظہار ہے۔

اس واقعہ میں مقامِ عبرت یہ ہے کہ جمیع اہل ایمان کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انسان کو بارگاہ ایزدی سے ملنے والے عہدوں اور مناصب میں سب سے بالا و عظیم منصب، منصبِ رسالت ہی ہے۔ تو ذرا اس پہلو پہ بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے کہ ایک حامل منصبِ رسالت کو اس کے استاذ کے سامنے کھڑا کر کے اور ان کے باہمی رویوں اور طرزِ عمل کے خاص خاص پہلوؤں کو قرآن مجید میں اس قدر نمایاں انداز میں بیان کر کے اللہ رب ذوالجلال نے امت محمدیہ کو کیا تعلیم دی ہے؟ ایک عظیم المرتبت رسول خدا اگر اپنے استاذ کے روبرو اس قدر عاجزی و انکساری اور تواضع و فروتنی کا مظاہرہ کرتا ہے تو دنیاوی مناصب و مراتب کے حامل افراد اور ان کے بچوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ معاشرے میں کوئی خواہ کتنا ہی بلند رتبہ، سماج میں عزت و شہرت، جاہ و حشم اور شوکت و سطوت کا مالک ہی کیوں نہ ہو ایک استاذ کے سامنے آداب کا پورا پورا لحاظ اس پر لازم اور ضروری ہو جاتا ہے۔ بالخصوص جب وہ استاذ اپنے منصب کے حوالے سے اپنی جملہ ذمہ داریوں کو اخلاص و نیک نیتی اور تندہی کے ساتھ پورا کرنے کے عمل میں مشغول اور اسی حوالے سے متعارف بھی ہو۔ یوں ادب و احترام کے ساتھ پیش آنے میں ہی عزت بھی ہے اور عافیت بھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح ایک استاذ پر بھی یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اپنے طلبہ کے مابین کسی فرق مراتب کا لحاظ نہ کرے۔ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھے۔ ناپائیدار اسباب و مفادات کی بناء پر طلبہ کو پسندیدہ اور ناپسندیدہ کے طبقات میں تقسیم کر دینے کا عمل تو نرا سم قاتل ہے۔ بلکہ ایسی سرگرمیاں تو اپنے ہی ہاتھوں معلّمی جیسے عظیم عطیہ خداوندی کی بے توقیری اور ناقدری کے مترادف ہیں۔ یوں عزتِ نفس کی پامالی اور ہتک کا ماحول و اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ سوچا جا سکتا ہے کہ جو استاذ اپنے تلامذہ کے مابین مساویانہ برتاؤ نہ کر سکے وہ بنی نوع انسان کو مساوات کا کیا سبق دے سکتا ہے؟

الغرض استاذ کی حقیقی عظمت کا احیاء کیے بغیر اس قوم کی صحیح اور مضبوط بنیادوں پر تعمیر و ترقی کا عمل ناممکن ہی نظر آتا ہے۔ تاریخ اور ترقی یافتہ اقوام عالم کے عملی تجربات کی شہادت کے بعد تو اس امر میں ذرہ برابر بھی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ یہ قوم رسول ہاشمی کامیابی و کامرانی کے ساتھ قوموں کی صف میں ایک باعزت و باوقار مقام حاصل کرنے کے لائق تبھی ہوگی جب اس کے ہاں کی معلّمی کو پیغمبری کا سراغ ہاتھ آئے گا۔

رہا یہ سوال کہ اس واقعہ کے رونما ہونے کا ظاہری سبب کیا تھا؟ صحیح بخاری کی روایت ہے:

اِنَّ مُوسٰی قَامَ خَطِیبًا فِی بَنِی اِسرَائِیلَ فَسُئِلَ : اَیُّ النَّاسِ اَعلَمُ ؟ فَقَالَ اَنَا! فَعَتَبَ اللّٰہُ عَلَیہِ اِذ لَم یُرِدِ العِلمَ اِلَیہِ . قَالَ بَل لِی عَبدٌ بِمَجمَعِ البَحرَینِ. ھُوَ اَعلَمُ مِنکَ. قَالَ: اَی رَبِّ وَ مَن لِّی بِہٖ وَ رُبَّمَا قَالَ سُفیٰنُ : اَی رَبِّ فَکَیفَ لِی بِہٖ.(۲۱)

ترجمہ: کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ایک اجتماع میں خطبہ دینے میں مشغول تھے کہ آپ علیہ السلام سے سوال کیا گیا: لوگوں میں سب سے زیادہ علم والا کون ہے؟ آپ علیہ السلام نے جواب دیا: ''میں''۔ اس بات پر اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب فرمایا کہ واللہ اعلم کیوں نہ کہا۔ آپ علیہ السلام سے فرمایا: بلکہ مجمع البحرین کے مقام پر میرا ایک اور بندہ ہے۔ وہ تم سے زیادہ جانتا ہے۔ ملتجی ہوئے: میرے پروردگار مجھے اس کے پاس کون لے کے جائے گا؟ حضرت سفیان کے بارے میں امام بخاری فرماتے ہیں: وہ یوں بھی روایت بیان کرتے تھے کہ میں اس تک کیسے پہنچوں؟

اس بات سے یہ رہنمائی تو یقیناً ملتی ہے کہ بات جب علم کی ہو رہی ہو تو کوئی بھی شخص عقل کل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ سائل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہنا یہ چاہیے تھا کہ ''واللہ اعلم''، یعنی اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ آپ علیہ السلام کا یہ کہنا کہ ''انسانوں میں سب سے زیادہ علم اس وقت میرے پاس ہے'' گو بظاہر رسول خدا ہونے کے ناطے حق بجانب تھے، مگر رب ذوالجلال کو پھر بھی گوارہ نہ ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا ایک جلیل القدر پیغمبر اگر خشک و تر کے علم کا حامل ہونے کا ادعا نہیں کر سکتا تو پھر کسی عام شخص کا علمی گھمنڈ چہ معنی دارد؟ اپنے علم پر فخر و غرور تو ہم میں سے کسی کو بھی زیب دیتا ہے نہ ہمارے لیے روا ہو سکتا ہے۔ قانون قدرت ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ. (یوسف: ۷۶)

ترجمہ: ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں اور ہر عالم کے اوپر ایک زیادہ علم والا ہوتا ہے۔

علم ایک لامتناہی حقیقت ہے۔ جس پہ کوئی بھی انسان پوری طرح حاوی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اپنی صلاحیتوں کو بہتر سے بہتر بنانے کی لگن اور مسلسل جدو جہد ایک استاذ کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے۔ ایک اچھا استاذ پہلے خود ایک اچھا طالب علم ہوتا ہے۔ مطالعاتی انجماد بلاشبہ ذہنی استعداد اور علمی وفکری صلاحیتوں کو ختم کر دینے والا ایک مرض ہے۔ اور یہی انجماد اگر طویل عرصے تک قائم رہے تو قیمتی صلاحیتوں کو بے موت مار دیتا ہے۔

معلّمی کی راہ پر چلنے والوں کو عالم رنگ و بو پہ قناعت سے بھی گریز ہی کرنا چاہیے۔ ایک معلم کے لئے، بالخصوص نئی روشنی کے اس دور میں، ماضی اور ماں باپ کے سکھائے ہوئے پہ ہی قناعت کر کے بیٹھ جانے کی کسی صورت کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کسی بڑی علمی شخصیت کے مقابلے میں ایک عام آدمی کے پاس کسی معاملے میں یا کسی خاص شعبے میں زیادہ بہتر معلومات ہوں۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اسی سے لوگوں میں مسابقت کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ اس کی سادہ سی مثال یہ ہے کہ آج کے دور میں چھوٹے چھوٹے بچے موبائل فون اور کمپیوٹر کے کئی پروگرام نہایت عمدگی، مہارت اور شوق سے اوپریٹ کرتے ہیں۔ جبکہ والدین عام طور پر ان کی الف، ب سے بھی آشنا نہیں ہوتے۔ چنانچہ ماں باپ کو حصول علم کی لگن نصیب ہو تو اپنے بچوں سے پوچھنے اور ان سے سیکھنے سے بھی گریز نہ کریں۔ نسبی لحاظ سے ماں باپ کی عظمت ایک مسلمہ قدر کے طور پر محفوظ ہے اور محفوظ رہے گی۔ علم و ہنر کی قدر شناسی اپنی جگہ، اپنی اولاد سے استفادہ کرنے پر ماں باپ کے رتبے میں کسی کمی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

تذبذب اور جھجک و ہچکچاہٹ حصول علم کی راہ کے بھاری پتھر ہیں۔ اور معاملہ جب استاذ کا ہو تو ان بھاری پتھروں کو ہٹانا اور اپنے لیے باوقار راستہ کھوجنا اس کے لیے اتنا ہی ضروری ہو جاتا ہے کہ جتنی اس کی اپنی بقاء کی تدابیر۔ علامہ ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ دونوں بزرگوں کی ملاقات کے واقعہ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

اَلْمَفْضُوْلُ قَدْ يَكُوْنُ لَهُ فَضْلٌ جُزْئِيٌّ عَلٰى مَنْ هُوَ اَفْضَلُ مِنْهُ وَعَلٰى اَنَّ الْفَاضِلَ يَنْبَغِي لَهُ اَنْ يَّطْلُبَ هٰذِهِ الْحِصَّةَ مِنَ الْفَضْلِ مِنَ الْمَفْضُوْلِ. (۲۲)

ترجمہ: کبھی کبھار ایک فاضل شخص کے مقابلے میں اس سے کم رتبہ شخص کو جزوی علمی برتری حاصل ہو جایا کرتی ہے۔ سبق یہ ملتا ہے کہ اس فاضل شخص کو چاہیے کہ اس شخص سے فضیلت کا یہ حصہ بھی سیکھ لے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام تو شریعت کا علم دیکر بنی اسرائیل کی ہدایت و راہبری اور تعلیم کیلئے بھیجے گئے اور اللہ کے نمائندے اور مختار بنے۔ آپ کا تعلق شعبہ تشریع سے ہے جبکہ احادیث اور مفسرین کے بیانات سے باور ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کائناتی علم کے حامل اور امور تکوینیہ کے محرم و شناسا ہیں۔ (۲۳) دونوں بزرگوں میں سے حضرت موسیٰ علیہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

السلام تو اپنے شعبے کے مختار بھی ہیں اور ماہرِ فن بھی۔ کیونکہ ہر رسول امورِ دینیہ وشرعیہ کی تعلیم وتبلیغ کی خاطر بارگاہِ حق سے ماذون ہوتا ہے۔اور فیض یافتہ بھی ہوتا ہے۔ بایں طور یہ تعلق ''تشریعی'' امور سے بنتا ہے۔ البتہ پیش آمدہ واقعات ومعمولات پر ایک عمیق تر نظر ڈالی جائے تو ان کی نوعیت ''تکوینی'' ہے۔اس لحاظ سے دونوں کا دائرہ کار واختیار اپنا اپنا اور مزاجاً بہت مختلف معلوم ہوتا ہے۔ ایک کو دوسرے کے شعبے کے بارے میں معلومات تو حاصل ہیں مگر وہ مہارت نہیں جو دوسرے کے پاس ہے۔ ہمارے دور میں رسمی درس گاہوں میں مختلف مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ اور ہر مضمون کیلئے بالخصوص اسی خاص مضمون میں ایک حد تک مہارت رکھنے والے افراد کا تقرر عمل میں لایا جاتا ہے۔مختلف مضامین کے ان اساتذ کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس نکتے کو ہمہ وقت پیش نظر رکھیں۔اور دیگر مضامین کے اساتذہ سے ان کے شعبے سے متعلقہ معاملات میں اگر رہنمائی لینے کی ضرورت پیش آجائے تو انہیں چاہئے کہ تردد وتامل کو خاطر میں نہ لائیں۔ بلکہ اساتذہ کے مابین ایسے روابط کا فروغ ان کے طلبہ کیلئے زیادہ جاندار اور مفید معلومات کی بہم رسانی کا ایک موثر اور ٹھوس وسیلہ بن سکتا ہے۔

اپنے زیرِ تربیت افراد کا تزکیہ نفس کرنا ایک استاذ کا فرض منصبی ہے۔ نیز ان کے فکر وعمل میں در آنے والی ہر طرح کی میل کچیل کو دور کرتے ہوئے ان کو حکمت ودانائی سکھانا ہوتا ہے۔فقط الفاظ اور ان کے معانی ہی کی تعلیم مقصود نہیں۔ یہ تو فقط آلہ وذریعہ ہیں فہم ودانش کے حصول کا۔ انہی پر قناعت کا حاصل کچھ نہیں ہے۔ان کی وساطت سے ایک اچھا استاذ اپنے طلبہ کی توجہ ان پہلوؤں کی جانب موڑ دیتا ہے جو کہ دانش وبینش کو مہمیز دیتے ہیں۔ زیورِ تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنے کے بعد ایک استاذ اپنے تربیت یافتہ افراد کو جادہ مستقیم پہ گامزن کر دیتا ہے۔اور جادۂ مستقیم پر استقامت کا عملی مظاہرہ کرنے والے افراد ہی درحقیقت ملک وقوم کا اثاثہ اور ان کے لیے مفید وکار آمد ہوتے ہیں۔قومی تعمیر وترقی کی تاریک راہوں کو روشن کرنے کا یہی عمدہ دستور ہے۔ بنی نوع انسان کے باہمی تفرقات وامتیازات کو دور کرنا، نفرتیں مٹانا اور محبتیں بڑھانا اس راہ کے دیگر چند اہم سنگ میل گنے جاتے ہیں۔ان بڑے اہداف اور بلند مقاصد کا حصول ظاہر ہے کہ آسان کام نہیں۔ ہر کام پر جانکاری اور ہر منزل پہ جانفشانی کی ضرورت ہوتی ہے۔اور ہمارے پیارے نبی ﷺ کی سنتِ مبارکہ بھی یہی ہے۔تبلیغ حق کے لیے اور کفار ومشرکین کو راہ راست پر لانے کی خاطر حضور رحمت عالمیاں ﷺ نے جس محنت وجانفشانی سے کام لیا قرآن حکیم نے اس کا نقشہ یوں پیش کیا ہے:

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ. (الشعراء: ۳)

ترجمہ: ''لگتا ہے کہ آپ جی جاں سے گزر جائیں گے اگر یہ لوگ ایمان والوں میں شامل نہ ہوئے تو''

فارسی کی ایک مشہور کہاوت ہے: ''نوش بے نیش حاصل نمی شود'' جس کا مفہوم یہ ہے: بغیر ڈنک کھائے شہد ہاتھ نہیں آتا۔شہد ایک ایسی قیمتی شے ہے جسے قرآن حکیم نے مختلف بیماریوں سے شفاء کا ذریعہ بتایا ہے۔ارشادِ باری تعالی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے:

وَاَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ o ثُمَّ کُلِیۡ مِنَ الثَّمَرٰتِ فَاسۡلُکِیۡ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا، یَخۡرُجُ مِنۡۢ بُطُوۡنِهَا شَرَابٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ فِیۡهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ o

(النحل:٦٨ و ٦٩)

ترجمہ: اور تمہارے رب نے شہد کی مکھیوں کو حکم دیا کہ اپنے گھر بنائیں پہاڑوں میں اور درختوں اور چھتوں میں۔ پھر ہر طرح کے پھلوں سے پیٹ بھریں پھر اپنے رب کی راہوں پر فرمانبردار ہو کر چلتی رہیں، ان کے پیٹوں سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اس میں لوگوں کے لیے شفاء ہے۔ طے شدہ بات ہے کہ اس میں غور وفکر کرنے والی قوم کے لیے بڑی نشانی ہے۔

شہد اپنے اندر یہ سب خوبیاں رکھتا ہے۔ یہ شرف و اعزاز بھی رکھتا ہے کہ قرآن حکیم میں اس کی تعریف و توصیف وارد ہوئی ہے۔ انہی خوبیوں اور کمالات کے باعث اس کا حصول آسان نہیں مشکل تر رکھا گیا ہے۔ بڑی مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ حفاظت پر مامور بے شمار مکھیوں کے زہرناک ڈنکوں کے پیچھے چھپی ہوئی اس نعمت کو حاصل کر کے سنوارنا پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ نعمت جتنی گراں قدر ہوگی اس کے حصول کے لیے محنت و مشقت بھی اتنی ہی زیادہ درکار ہوگی۔ یہ ایک ایسا قانونِ قدرت ہے کہ جس کا تجربہ ہمیں اپنے روزمرہ میں جابجا ہوتا ہے۔ علم بھی ایک بڑی نعمت ہے۔ بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی وہ سب سے پہلی اور بڑی نعمت وعطا ہے جس کی بدولت ملائکہ پر برتری ملی تھی۔ چنانچہ اس کے حصول کے لیے محنت بھی اسی قدر زیادہ درکار ہوگی۔ اور نصیب ہو جائے تو شرف ووقار میں اسی پیمانے سے اضافہ ہوگا۔

حصولِ علم کی لگن رکھنے والوں کو اس بات کا لحاظ بھی رکھنا چاہیے کہ فی زمانہ بی اے اور ایم اے تک کی تعلیم حاصل کرنے اور سند لے کر خود کو پڑھا لکھا سمجھ لینا ایک بھی بڑی غلطی ہے۔ وہ پڑھے لکھے نہیں پڑھنے لکھنے کے قابل ہوئے ہیں۔ اگر پڑھائی لکھائی کا تسلسل جاری ہے تو ٹھیک ورنہ ان کی اس صلاحیت پر بھی گرد جمنے لگ جائے گی۔ ایک وقت آئے گا کہ ان کے ہاتھ خالی رہ جائیں گے۔ دنیا ان سے بہت آگے نکل جائے گی۔

اللہ رب ذوالجلال نے مختلف وقتوں میں مختلف قوموں اور علاقوں کی طرف اپنے برگزیدہ نبی اور رسول مبعوث فرمائے ہیں۔ ان برگزیدہ ہستیوں نے بنی نوع انسان میں تعلیم وتربیت اور تزکیہ نفس کی طرح ڈالی ہے۔ ان کو وحیٔ الٰہی کے ذریعے رہنمائی ملتی رہی۔ چنانچہ تاریخ ماضی کے مختلف ادوار میں الہامی صحیفے اور کتابیں بھی نازل ہوتی گئیں جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ بنی نوع انسان کی ذہنی استعداد بھی بڑھتی رہی۔ چنانچہ ضروریات بھی بدلتی رہیں اور اسی مناسبت سے احکام بھی بدلتے رہے۔ ہدایت وراہبری کے لئے مختلف اوقات میں اتارے جانے والے ان الہامی صحیفوں میں قرآن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکیم سب سے آخری صحیفہ ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو رشد وہدایت کے تعلق سے اپنی حیثیت میں یہی حرف آخر ہے اور یہی نقش تمام ہے۔ اپنے نشو وارتقاء کے مراحل سے گزر کر قافلہ ٔنوع انسانی جب نئی روشنی کے ہمارے اس جدید عہد کے عین سرہانے آ پہنچا تو اس کتابِ مبین کا نزول ہوا ہے۔ نزول قرآن حکیم کی تکمیل ہوئی تو ساتھ ہی وحی ٔالٰہی کی نعمت بھی تمام اور پوری ہوگئی۔ اس طرح وحی ٔالٰہی اور ہدایتِ ایزدی کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔ روئے زمیں پر اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا دین اور انسانی حیات کے لیے نظام العمل بھی از ہمہ پہلو مکمل ہوگیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۔

(مائدہ:۳)

ترجمہ: آج میں نے تم لوگوں کے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تمہارے اوپر اپنی نعمت پوری کر دی ہے اور تم لوگوں کے لئے اسلام کو بطورِ دین پسند کر لیا ہے۔

لہٰذا آج چودہ صدیاں بیت جانے کے بعد بھی قرآن حکیم ہی قدرت کی طرف سے عطا کردہ واحد راہِ ہدایت اور ذریعہ ٔنجات ہے۔ یہی نہیں اب قیام قیامت تک اس کی یہی حیثیت قائم اور باقی رہے گی۔ اس کا کوئی متبادل ہوا ہے نہ کبھی ہوگا۔ یہ علم و دانش کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ علم و دانش کے حصول کا ہنر بھی دیتا ہے۔ اور نئی نسل کو اس کی منتقلی سمیت حیاتِ اجتماعی وشخصی کے ہر ہر پہلو کو نہایت خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ بیان بھی کرتا ہے۔ چنانچہ جب اور جہاں کہیں بھی اب افرادِ انسانی کی تعلیم وتربیت اور تعمیر شخصی اور ذہن سازی کا معاملہ درپیش ہوگا قدرت کے انتظام کے تحت قرآن حکیم کی طرف رجوع ناگزیر ہو جائے گا۔ اسی طرح شخصی واجتماعی طور پر افرادِ انسانی کی ذہنی وجسمانی تہذیب واصلاح کا سوال جب کبھی سر اٹھائے گا اور جب کبھی ایک صحتمند اور فلاحی معاشرے کے قیام کی طرف پیش قدمی کی ضرورت محسوس کی جانے لگے گی تو ان مواقع پر قرآن حکیم سے رہنمائی لئے بغیر کوئی اَور حقیقی چارہ ٔ کار نہیں ہوگا۔

چنانچہ اب عصر حاضر میں اس سوال کا جواب مطلوب ہے کہ ''بحیثیت مسلمان قوم ہماری نصابی اساس کیا ہونی چاہیے''؟ اس سوال کا درست اور صائب جواب یہی ہے کہ وہی جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ نے بنی نوع انساں کے لیے نصابی اساس بنایا اور مقرر کیا ہے۔ اور وہ اساس ہے ''اللہ کی یہی آخری کتاب قرآن مجید فرقان حمید''۔ بڑی بحث وتمحیص اور ردوکد کے بعد حالات اس نہج پر آئے ہیں کہ لوگوں کے اندر ایک طبعی میلان پیدا ہوا ہے۔ اب اہل ایمان میں اس معاملے میں دورائے نہیں ہوسکتیں۔ قبل ازیں اس کے ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہ اور خاص وعام پر اطلاع نہ ہونے کا بہانہ کر کے لوگوں کو اس سے دور کر دیا گیا تھا۔ صرف اس کی تلاوت ہی باعث ثواب جانی اور مانی جاتی تھی۔ اور ایک دیرینہ روایت کے طور پر اپنے مرحومین کو ایصال ثواب کی خاطر ہی زیادہ تر اس کی تلاوت رہ گئی تھی۔ مگر اب لوگوں کی آنکھیں کھلی ہیں۔ اس کے ترجمہ اور معانی ومطالب پر مطلع ہونے کی احتیاج شدت سے محسوس کی جانے لگی ہے۔ چنانچہ طلب بھی بڑھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہی ہے اور اہتمام بھی ہوتا نظر آتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنے ہی لوگوں میں سے جو جو "یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا وَّیَہۡدِیۡ بِہٖ کَثِیۡرًا (البقرہ:) " اللہ تبارک وتعالیٰ کا قانون قدرت اس کے ذریعے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دے دیتا ہے" سے خوف دلا کر لوگوں کو قرآن کی طرف مائل ہونے سے روکا کرتے تھے اب وہ بھی اس ضرورت سے آگاہ اور بڑی حد تک قائل وآمادہ ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہے۔ جو کئی طرح کی تبدیلیوں کے لیے راہ ہموار کرے گی۔

بحیثیت مسلمان قوم ہماری دانش وبصیرت کا حقیقی منبع وسرچشمہ قرآن مجید فرقان حمید ہے۔ لٰہذا یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ ہماری نصابی اساس فقط اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ آخری کتاب قرآن حکیم ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب فرقان بھی ہے، میزان بھی ہے، محفوظ بھی ہے اور محافظ بھی۔ یہ کتاب مبین اللہ تعالیٰ کی حفظ وامان میں ہے۔ (الحجر:۱۴) اس حفاظتِ خداوندی کا راز یہی ہے کہ اب قیامت تک جب بھی ایسا ہو کہ اسلامی تعلیمات پر لوگوں کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے جہالت کی دبیز تہ چڑھ جائے، نورِ ہدایت مستور ہو جائے اور تاریکیاں چھا جائیں تو جب ٹھوکریں اور ماریں کھانے کے بعد لوگ حق وہدایت اور اس کتاب اللہ کی طرف مراجعت کا ارادہ کرلیں تو ان خصوصیاتِ مندرجہ بالا کی حامل یہ کتابِ مبین ان کا ہاتھ تھام کر ان کو کنار عافیت تک پہنچا دے۔

استعماری تسلط سے آزادی کے بعد مسلمانوں میں نئی اُٹھان کی جو امنگ بیدار ہوئی اور تازہ لہر پیدا ہوئی ہے وہ بھی کتاب اللہ کی طرف اسی مراجعت کی مؤید اور حامی نظر آتی ہے۔ رجوع الی الکتاب کے بغیر اب کوئی اور صورت ایسی نظر نہیں آتی جو آنے والے حالات میں مسلم قوم میں اصلاح اور فلاح کے بند راستے کھولنے کی پوری قوت اپنے اندر رکھتی ہو۔ اور فلاح وکامرانی کی امید دل میں لے کر جس کے دامان رحمت سے وابستہ ہوا جا سکے۔ ایک وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو امتِ مسلمہ میں گروہی رنگا رنگی، افتراق وانتشار اور فرقہ واریت کے مکمل خاتمہ اور صفوں میں اتحاد ویکجہتی پیدا کرنے کے لیے بھی ہمارے پاس کتاب اللہ ہی ایک ٹھوس بنیاد ہے۔ رب ذوالجلال نے قرآن حکیم میں ہی اس امر کی بھی نشاندہی فرما رکھی ہے کہ قرآن سے دوری ومہجوری کا وطیرہ اختیار کیا گیا تو رسول کریم ﷺ کل قیامت کے روز بارگاہِ حق میں استغاثہ فرمائیں گے۔ ارشاد ہے:

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا. (الفرقان: ۳۰)

ترجمہ: اور یقینی بات ہے کہ رسول اللہ استغاثہ فرمائیں گے کہ اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو مہجور ومتروک بنا دیا تھا۔

ماضی میں اسی سے دوری ومہجوری اور دیگر ذرائع اور مآخذ پر ہمارے کلی انحصار کے عمل نے امت میں گروہ بندی اور انتشار کو جنم دیا تھا۔ یہ واقعی ایک بہت بڑی غلطی تھی۔ ہم آج بھی اپنی اسی غلطی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ تقریباً چودہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صدیوں سے اسی افتراق کے باعث اس قوم میں ایک خانہ جنگی کی کیفیت ہے جو مسلسل جاری ہے۔اس خانہ جنگی و باہمی خونریزی کا بنیادی محرک یہی گروہ بندی اور فرقہ واریت ہے۔فرقہ وارانہ اور گروہی بالادستی کے قیام کی خواہش کے تحت ہی یہ سب کچھ ہورہا ہے۔اور اگر کہیں معاملہ اس سے ہٹ کر نظر آئے ،مثلاً لسانی وسیاسی ،تو بھی دھیان میں رہنا چاہیے کہ مذہب کی آڑ میں کی گئی اس واردات نے ہی لوگوں کو یہ راستے دکھائے ہیں۔بہر طور بنیاد یہی ہے۔اس خانہ جنگی کے بھیانک نتائج کا سامنا کرتے ہوئے ہم نے صدیاں گزار دی ہیں۔مجال ہے کہ متحاربین میں سے کسی کے ہاتھ کچھ آیا ہو۔خسارہ ہی خسارہ ملا ہے ہر فریق کو۔طرفہ تماشا ہے کہ کوئی بھی شخص اگر کسی مخالف گروہ سے وابستہ لوگوں کی مجلس وصحبت اختیار کرلے۔انہی تک اس کا اٹھنا بیٹھنا محدود ہوجائے۔انہی کی مخصوص کتابیں اس کے زیر مطالعہ رہیں۔اور باقی یا باہر کی دنیا کی اس کو ہوا تک نہ لگنے تو کچھ ہی عرصہ میں وہ اس گروہ یا فرقہ کی طرف مائل اور اس کی صحت کا قائل ہوجائے گا۔حتی کہ اپنے سابق گروہ سمیت باقی سب کے لیے اس کے دل میں تنفر اور تشدد تک کے رجحانات ومیلانات جگہ بنانے لگ جائیں گے۔یہی وجہ ہے کہ تمامی گروہوں کے رکھوالے اس خوف سے کہ ان کے لوگ کہیں ان کے مخالف گروہ میں نہ چلے جائیں، ان کے اندر نفرت وتعصب کو پیدا کرتے اور مسلسل اس کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔اگر ایک دوسرے کے خلاف نفرت وتعصب پیدا کرنے پر ہی کسی طرح پابندی لگ جائے اور سختی سے بیس پچیس سال تک ہی اس پر عمل درآمد ہوجائے تو فرقہ واریت اپنی موت آپ مرجائے گی۔للہذا حق کا معیار یہ نہیں ہے کہ ہم کسی خاص سوچ وفکر کے قائل و دلدادہ ہوجائیں۔نہ ہی ہماری طبیعتیں حق کی میزان یا معیار ہیں۔یہ اصولی بات ہے کہ "إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي" (یوسف:۵۳)"یقینی بات ہے نفس تو برائی پر ہی اکساتا ہے سوائے اس کے کہ میرا رب مہربان ہوجائے"۔

چنانچہ قومی زندگی کا سبق سیکھنا ہے تو اس کی نصابی اساس فقط قرآن حکیم ہی ہے۔قومی وحدت وجمعیت اور اس کی بقاء وسلامتی تک کی ضامن یہی کتاب ہے۔اور جب تک یہ نہیں ہوگا مصائب وآلام کی یورش بھی نہیں تھمے گی۔ہم میں اب بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو پرانے جھگڑوں کو "فی سبیل اللہ" زندہ رکھنے پر مصر ہیں۔یہ روش جاری رہی تو کچھ دن اَور مصائب وآلام کی یورش رہے گی۔مگر انجام کار سب دیکھیں گے کہ قرآن حکیم نے فرقہ واریت سے بچنے پر جو بے پناہ زور دیا ہے اس کی وجوہات کیا ہیں اور فوائد وثمرات کیا کیا ہیں؟ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ ان احکام سے بغاوت وسرکشی کی پاداش میں قعر مذلت کے سوا کسی اَور جگہ نہیں پہنچا جاسکتا۔یہ بات پوری طرح عیاں ہے کہ ان احکام سے انحراف کا نتیجہ کسی نیکی یا بھلائی کی بنیاد نہیں بن سکتا۔اللہ کی ناراضی اور اس کی نعمتوں اور برکتوں سے محرومی البتہ ضرور ملے گی۔ان پہلوؤں پر اگر ابھی لوگوں کا دھیان کم ہے تو کچھ دن اَور ٹھہر جائیے۔حالات جاریہ بہت سنگین نہج تک آگئے ہیں۔پھر بھی اگر یہ لوگ نہ سنبھلے تو قدرت کی بے آواز لاٹھی کے حرکت میں آنے کی دیر ہے۔پھر جب متوجہ ہوں گے تو اس گروہ بندی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرقہ واریت کے عبرتناک انجام سے بھی نہایت بیش قیمت سبق سیکھیں گے۔ لہٰذا ہمارا یہ تجربہ اور اس کی یافت آنے والے دنوں میں نئی اٹھان کی طرف پیش قدمی کے دوران ایک بہترین زادِ سفر کا کام دے گی۔ اس طرح اللہ کی یہ بے نظیر کتاب ہمیں آنے والے وقتوں میں نئی غلطیوں سے بچے رہنے اور حالات کو سازگار بنائے رکھنے کے عمل میں بھی سرمایۂ دانش وبصیرت ہی مہیا کرے گی۔ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰی.

مآخذ ومراجع

۱. شیخ الہند، محمود حسن، القرآن الکریم، مدینہ منورہ، شاہ فہد پرنٹنگ کمپلیکس، ۱۹۸۹ء، ص: ۱۳-۶۱۲، الزمر: آیات ۹و۱۸

۲. محمد جوناگڑھی، القرآن الکریم، مدینہ منورہ، شاہ فہد پرنٹنگ کمپلیکس، ۱۴۲۳ھ، ص: ۱۲۹۴و۱۲۹۶، الزمر: آیات ۹و۱۸

۳. بلیاوی، عبدالحفیظ، مصباح اللغات، کراچی، مدینہ پبلشنگ کمپنی، باراول: ۱۹۸۲ء، ص: ۶۲۷، مادّہ: ل ب ب۔

۴. گنگوہی محمد حنیف، تحفۃ الادب (شرح نفحۃ العرب)، کراچی میر محمد کتب خانہ، بلاسن طباعت، ص: ۱۴۵

۵. ابوتمام حبیب بن اَوس، الطائی، دیوان الحماسہ، لاہور، مکتبۂ سلفیہ طبع اول ۱۹۶۵ء، ص: ۱۹

۶. ایضاً ص: ۱۶۳ ۷. ڈاکٹر فضل الرحمٰن، اسلام اور جدیدیت (ترجمہ: محمد کاظم)، لاہور، مشعل بکس، سن ندارد، ص: ۲۱

۸. البانی، محمد ناصر الدین، سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ (مختصر ومترجم)، کراچی، فضلی سنز، سن ندارد، ص: ۵۷۲، بحوالہ: المعجم الکبیر للطبرانی۔

۹. قرآن حکیم، سورۂ کہف، آیات: ۶۷، ۶۸

۱۰. قرآن حکیم، سورۂ کہف، آیت: ۶۵

۱۱. بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب بدأ الخلق، باب حدیث الخضر مع موسیٰ علیہما السلام۔ نیز قشیری، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کراچی، قدیمی کتب خانہ، ۱۹۵۶ء، ص: ۲۶۹، ج: ثانی

۱۲. ازہری، کرم شاہ پیر، ضیاء القرآن، لاہور، ضیاء القرآن پبلیکشنز، ۱۳۹۹ء، ص: ۳۸، ج: سوم

۱۳. اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، دسمبر ۲۰۰۵ء، ص: ۶۰۲، ج: ۴

۱۴. رازی، محمد بن ضیاء الدین عمر فخر الدین، التفسیر الکبیر، مصر، مکتبۃ البہیہ، ۱۳۰۲، ص: ۱۴۹، ج: ۱۱، ح: ۲۱

۱۵. سیوہاروی، محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن، لاہور، مکتبۂ مدنیہ، ۱۳۶۹ھ، ص: ۵۴۴، ج: ۱

۱۶. علامہ نیاز فتحپوری، نیاز محمد خان، من ویزداں، لاہور، فکشن ہاؤس، اشاعت ۲۰۱۰ء، ص: ۴۴۵

۱۷. حقانی، محمد عبدالحق، دہلوی، تفسیر حقانی، دیوبند، کتب خانہ نعیمیہ، ص: ۴، ج: ۳

۱۸. قاضی منصور پوری، محمد سلیمان سلمان، رحمۃ للعلمین، کراچی، دارالاشاعت طبع اول ۱۴۱۱ھ، فٹ نوٹ ا، ص: ۲۶، ج: دوم

۱۹. دیکھیے: تکوین، باب ۱۴، فقرہ ۱۸، نیز عہدنامہ جدید، عبرانیوں کے نام، باب ۵، فقرہ: ۶ و ۷، فقرہ: ۱۰، باب: ۶، فقرہ ۲۰، اور باب ہفتم مکمل۔

۲۰. اصلاحی، امین احسن، تدبر قران، محولہ بالا ص: ۶۰۲، ج: ۴۔

۲۱. بخاری، محمد بن اسماعیل صحیح بخاری، کراچی، قدیمی کتب خانہ، ۱۹۶۱ء، ص: ۴۸۱، ج: اول

۲۲. المظہری ۔ محمد ثناء اللہ، النقشبندی، التفسیر المظہری، کوئٹہ، بلوچستان بک ڈپو، سن طباعت ندارد، ص ۵۱ ۔ ۵۰ ج: ششم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۳۔ صحیح مسلم کی روایت ہے: "اِنَّکَ عَلٰی عِلْمٍ مِّنْ عِلْمِ اللّٰهِ عَلَّمَکَهُ لَا اَعْلَمُهُ وَاِنِّیْ عَلٰی عِلْمٍ مِّنْ عِلْمِ اللّٰهِ عَلَّمَنِیْهِ لَا تَعْلَمُهُ" (ص:۲۶۹، ج ثانی) ''تم اس علم کی بلندیوں پر ہو جو اللہ نے تمہیں سکھایا ہے، میں اسے نہیں جانتا اور میں اس علم کی بلندیوں پر متمکن ہوں جو اللہ نے مجھے سکھایا ہے تم اسے نہیں جانتے'' نیز الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ بخاری نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کراچی، قدیمی کتب خانہ، ۱۹۶۱، ص:۴۸۱، ج: اول، علاوہ ازیں معروف مفسرین نے بھی اس حدیث کو اپنی تفاسیر میں نقل کیا ہے اور اس پر اعتماد کا اظہار بھی کیا ہے۔ دیکھیے: زمخشری، محمود بن عمر، جاراللہ، الکشاف، بیروت، دارالکتب العربی، ۱۹۴۷، ص ۷۳۲، ج: ثانی۔ نیز ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، حافظ عمادالدین، تفسیر القرآن العظیم، بیروت، دارالاندلس، ۱۹۶۶، ص:۴۱۰، ج چہارم۔

© rasailojaraid.com